مکتوب نگاری: تفہیم، تاریخ اور دائرۂ کار

حضرتِ انسان کو دیگر مخلوقات پر شرف و فوقیت بخشنے والی بے شمار خداداد صلاحیتوں میں سے غالباً اس کی قوتِ متخیلہ اور قدرتِ اظہار بلند تر مقام کی حامل ہیں۔ تاریخ و تہذیب کے آغاز پر انسان نے جب خاندان اور قبیلے جیسے معاشرتی اِدارے تشکیل دینا شروع کیے ہوں گے، تو یقیناً ان اِداروں کی بقا اور نمو کے لیے سوچ بچار شروع کی ہوگی۔ مگر جب تک اس سوچ بچار کا حاصل دیگر افراد کے سامنے بیان نہ کیا جاتا یہ عمل سعیِ لاحاصل کے مترادف ہوتا۔ گویا اب انسان کو ایک مربُوط، قابلِ اعتماد اور قابلِ فہم نظامِ اظہار کی ضرورت تھی۔ ایک ایسا نظامِ اظہار جس کے ذریعے انسان اپنی ضروریات، کیفیات اور تخیلات کو دیگر ہم جنسوں تک پہنچا سکے۔ چنانچہ قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کو زیرِ استعمال لا کر انسان نے جب پہلی بار اپنی قلبی واردات اور تخیلاتی فضا کو جیب کے گوپے میں رکھ کر اپنے ہم نشین تک اچھالا ہوگا اور مخاطب نے اس کی طرف بنظرِ تحسین دیکھ کر سر کو تفہیمی جنبش دی ہوگی تو اُن کی سرشاری کی کوئی حد نہیں رہی ہوگی۔ سرشاری کی اس کیفیت کی وجہ اظہار یا ابلاغ کی ایک صورت یعنی قوتِ گویائی کی دریافت تھی۔ اس قوت نے ارتقا کے مختلف مراحل طے کیے تو معاشروں کے اپنے اپنے معروضی حالات کے مطابق بولیاں اور زبانیں وُجُود میں آگئیں۔

زبانوں کی مناسب ترقی کے ساتھ ہی فنِ تقریر و خطابت پر دسترس رکھنے والے پُر جوش خطیب سامنے آئے۔ قبیلے کے دِل و دماغ کو مٹھی میں رکھنے کے لیے خطیبوں نے اپنے اظہار کو زیادہ مؤثر اور فصیح و بلیغ بنانے کے طریقے سوچے، تو کلامِ موزوں اور شعریت کی بنیادیں استوار ہوگئیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قبیلے کے جنگ اور امن کے معاملات میں متکلمین اور شعرا کو غیر معمولی رسوخ حاصل ہوگیا۔ ایسے جادو اثر خطیبوں کی بہت سی مثالیں ہمیں دورِ جاہلیت کے عرب معاشرے میں ملتی ہیں۔ قس بن ساعدۃ الایادی، اکثم بن صیفی، عمرو بن معدی کرب وغیرہ زمانہ جاہلیت کے معروف مقررین تھے۔ مؤخر الذکر دونوں خطیبوں کو نعمان بن المنذر نے کسریٰ نوشروان کے دربار میں عربوں کی سفارت کے لیے بھیجا تو عمرو نے تقریر کا آغاز اس طرح کیا:

انما المرء با صغریہ، قلبہ ولسانہ، فبلاغ المنطق السداد وملاك النجع الارتیاد و عفوالرای خیر من استکراہ الفکرۃ.....

آدمی اپنی دو چھوٹی چیزوں سے پہچانا جاتا ہے: ایک اس کا دِل اور دوسری اس کی زبان۔ طاقتِ گویائی کی معراج حق گوئی ہے۔ چراگاہ پانے کی کنجی تلاش و جستجو ہے.....[1]

کسریٰ نوشیروان نے ان خطیبوں کی تقاریر کو سراہا اور عربوں کے فنِ خطابت کی تعریف کی۔ مکہ کے جہلا کو سرورِ کائنات ﷺ کی ریاستِ مدینہ کے خلاف جنگ پر اکسانے والے خطیب اور شاعر ہی تھے۔ غزوۂ بدر کے وقت جب ایک موقع پر عتبہ سردارِ قریش نے مقتول عمرو بن الحضرمی کا خون بہا قبول کرنے اور بغیر جنگ لڑے واپس ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو مقتول کے

بھائی عامر بن الحضرمی نے ' واعمراہ، واعمراہ' پکارتے ہوئے لشکرِ قریش کو عمرو کے قتل کا بدلا لینے کے لیے جنگ پر اکسایا۔ اس کے پرجوش خطاب کے نتیجے میں قریش نے واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔[۲]

عہدِ جاہلیت میں مقررین کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ حصولِ فتح کے بعد مخالف قبیلے کے شاعروں اور خطیبوں کی زبانیں قسموں سے باندھ دی جاتی تھیں کہ وہ مفتوح قبیلے کو اپنی طلاقتِ لسانی سے دوبارہ آمادۂ جنگ نہ کر دیں۔ اس رسم کا نام 'شدِ لسان' تھا۔ عبد یغوث قحطنی ایک ایسے ہی موقع پر کہتا ہے:

اقول وقد شد والسانی بنسعته

امعشر تیم اطلقوا عن لسانیا

جب تیم نے میری زبان ڈورے سے باندھ دی تو میں نے اُن سے کہا کہ اے تیم میری زبان کھول دو۔[۳]

قوتِ ابلاغ میں صلاحیتِ مکالمہ کی اہمیت طے شدہ اور مُسلّمہ قرار پائی مگر یہ صلاحیت ان معانی میں ابلاغ کی کامل صورت نہ بن سکی کہ اس کا دائرہ اثر مخاطب کی قوتِ سماعت تک محدود و متعین تھا۔ جب کہ معاشرتی اور معاشی ضرورتیں انسان کو خاندان اور قبیلے سے دور اجنبی دیار و امصار کی خاک چھاننے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اب درپیش حالات سے عہدہ برا ہونے کے لیے انسان کو از سرِ نو نظامِ ابلاغ میں اس طرح اصلاح و اضافہ کرنا تھا کہ جسمانی فاصلہ اظہار میں مزاحم نہ ہو سکے۔ انسان نے ایک بار پھر قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر بہ ظاہر لاینحل نظر آنے والے اس سوال کا حل ڈھونڈ نکالا یعنی فنِ تحریر ایجاد کر لیا۔

تحریر کی ایجاد درجہ بہ درجہ ترقی سے ہوئی۔ پہلے پہل تصویروں، خاکوں اور نقشوں سے پیغام رسانی کا کام چلایا گیا۔ لیکن فنِ تحریر میں حقیقی پیش رفت اس وقت ہوئی جب تین ہزار قبل مسیح میں بابل و مصر کے درمیان جزیرہ نمائے سینا میں آباد آرامی نسل کی ایک شاخ نے حلق سے نکلنے والی آوازوں کے لیے نقوش مقرر کر لیے۔ ''یہ کل ۲۲ نقوش تھے۔ ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت۔''[۴] ایک روایت کے مطابق تحریر کے موجد حضرت ادریسؑ ہیں جن کا زمانہ چار ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ ہے۔ بہ ہر حال ان مساعی کے نتیجے میں ابلاغ کی دو صورتیں یعنی تقریر اور تحریر وجود میں آ گئیں۔ فنِ تحریر کے ذریعے انسان نے ابلاغ کے راستے میں حائل بُعدِ مکانی ہی نہیں بُعدِ زمانی کی رکاوٹ بھی دور کر دی۔ حتیٰ کہ نظامِ تحریر نے گونگے بہرے انسانوں کے لیے بھی ابلاغ کا عمل ممکن بنا ڈالا۔ اب انسان قلم و قرطاس کی وساطت سے دور دیس میں بسنے والے عزیزوں نیز آنے والی نسلوں کو، اپنا پیغام اسی اعتماد اور سہولت سے پہنچا سکتا تھا جیسے سامنے بیٹھے کسی شخص سے دو بدو مکالمہ۔

تحریر میں جب انسان نے مناسب استعداد بہم پہنچا لی تو نظامِ ابلاغ میں اس کی افادیت تقریر کے مساوی بلکہ بعض پہلوؤں سے برتر ہو گئی: اگر تقریر میں ابلاغ کی ترسیل برق رفتار تھی تو تحریر کی رسائی لامحدود، تقریر میں سحر پھونک ڈالنے کی صلاحیت تھی تو تحریر میں قائل کر لینے کی استعداد، پُرجوش مقررین اگر تقریروں کے ذریعے دِلوں کو گرمانے کی صلاحیت سے بہرہ مند تھے تو دُوسری طرف صاحبِ طرز انشا پرداز بھی قاری کو اپنے دِل نشیں اسلوب کا اسیر بنا لیتے تھے۔ پھر تحریر کی کچھ اضافی خوبیاں دریافت ہوئیں: یعنی یہ کہ محرر کو لکھنے سے پہلے اور لکھنے کے دوران میں سوچنے کا مناسب وقت مل جاتا مگر مقرر مضمون کی آمد کا محتاج ہوتا؛ محرر

لکھے ہوئے کو بدل دینے پر قادر تھا جب کہ مقرر بولے ہوئے کو مخاطب کی سماعت سے کسی طور مٹانے کی قدرت نہ رکھتا تھا۔ بسا اوقات متکلم بارعب مخاطب کے سامنے اظہارِ مدعا سے عاجز آجاتا:

دِل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

مگر محرر مکمل تخلیے کی حالت میں بلا جھجک دِلی واردات بیان کر لیتا۔ مقرر یا سامع اپنی ضرورت یا ذہنی بہاؤ کے تحت کہے سنے میں حسبِ حال کمی بیشی کر کے ابہام پیدا کر سکتا تھا؛ مگر تحریر کی صُورت میں کلام محفوظ و مدّون ہو گیا تو اس میں ردوبدل یا کمی بیشی کا امکان نہ رہا۔ تحریر کی اسی خوبی کی نشان دہی قرآن مجید میں اس طرح کی گئی:

بل ھوقران مجید۔ فی لوح محفوظ[البروج:۲۱،۲۲]

خالقِ کائنات نے اپنے لاریب کلام کی حفاظت کے لیے لوح و قلم کو اعزاز بخشا تو آنے والے زمانوں میں اعتبار کا درجہ صرف لکھے ہوئے کو ملا۔

خط نویسی یا مکتوب نگاری کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود فنِ تحریر یا شاید حدِ سماعت سے باہر چلے جانے والے کسی اپنے سے مکالمے کی شدید خواہش ہی وہ طاقت ور محرک تھی جو تحریری نظام کی تشکیل کا باعث بنی۔ کُچھ بھی ہو فنِ تحریر اور خط کا تعلق قدیمی اور ابتدائی ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ عربی میں تحریر کو ہی خط کہتے ہیں۔ فارسی اور اُردو جیسی زبانوں میں خط کی اصطلاح بہ یک وقت فنِ تحریر اور مکتوب کے لیے مستعمل ہے۔ خوش خط، بدخط، رسم الخط اور رسم الخط کی جملہ اقسام خطِ کوفی، خطِ تعلیق، خطِ نسخ، خطِ شکستہ، خطِ نستعلیق وغیرہ جیسی تراکیب خط کی اصطلاح کو بطورِ فنِ تحریر برتنے کی مثالیں ہیں۔ جب کہ دوسری طرف خط کا مکتوب کے معنی میں استعمال مشہور اور معروف ہے۔ خط کا انگریزی متبادل 'لیٹر' بھی ایک ساتھ حرف اور مکتوب کے معانی دیتا ہے۔ اس سب کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ہر خطے میں تحریر اور خط کو رواج دینے والے بہ ہر حال انسان ہی تھے، جو جغرافیائی تقسیم کے نتیجے میں بولیاں تو مختلف بولتے تھے مگر فطرت یکساں رکھتے تھے۔

اِسلامی یا عربی تہذیب میں کسی شخص کے علمی و ادبی مقام کا تعین ہی اس کی مُکاتبت و دبیری میں مہارت کے درجے سے ہوتا تھا۔ اس معاشرے میں مُکاتبت و اِنشا میں مہارتِ تامہ نہ صرف علمیت کا ثبوت تھی بلکہ مذکورہ فرد کے لیے عزت و مرتبہ کی ضامن بھی۔ اِنشا پردازی کے عملی جوہر دکھانے کا میدان مکتوب نگاری تھا۔ اِنشا و مُکاتبت لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں فنِ اِنشا کا نصاب دراصل مُکاتبت ہی کا درس تھا۔ دِل چسپ امر یہ ہے کہ تمدن کے اس ابتدائی دور میں بھی مکتوب نگاری کا عمل محض دو افراد کا نجی معاملہ نہ تھا بلکہ اسے اجتماعی تہذیبی ادارے کا مقام حاصل تھا۔ معاشرے میں فنِ تحریر سے آشنا افراد کم یاب تھے جب کہ دور دراز بسنے والے تعلق داروں سے مخاطب ہونے کے خواہش مند عام۔ اگر ایک طرف خط لکھوانے کے لیے تلاشِ بسیار کے بعد بستی میں موجود کسی لکھے پڑھے شخص کا پتا لگایا جاتا تو خواندگی کے لیے مکتوب الیہ کو بھی کسی دوسری بستی میں کچھ ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑتا۔ جس کے نتیجے میں خط لکھنے اور پڑھنے والے پیشہ وروں یا رضا کاروں کے درمیان ایک دوسرے سے دوستانہ استفادے یا حریفانہ چشمک کی فضا پیدا ہو جاتی۔ خط بھیجنے اور وصول کرنے والے بھی جہاں خبر کی ترسیل یا رسید سے آگاہی حاصل کرتے وہیں خط نویس کے فنِ اِنشا کے بارے میں بھی اپنی رائے قائم کرتے۔ حُسنِ خوبی سے

مدعا بیان کر سکنے والے اِنشا نگار سے خط لکھوانے کی کوشش اور فرمائش کی جاتی۔ اُردو کے صاحبِ طرز مکتوب نگار مرزا غالب نے کچھ ایسی ہی صورتِ حال کی منظر کشی اپنے شعر میں کی ہے:

اگر لکھوائے اس کو خط کوئی تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

خط نویسی کی اس روِش نے جلد ہی اسے مخصوص رنگ رُوپ دے دیا۔ آگے چل کر مکتوب نگاری کے بارے میں اپنائے گئے اجتماعی رویے نے بہ ظاہر خبر کی ترسیل کے اس سادہ سے ذریعے کو اہلِ مشرق کے ہاں خاص فنی نزاکتیں عطا کیں۔ مکتوب نگاری کی ان ہی فنی نزاکتوں پر عربی فارسی زبانوں میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ مقاماتِ ابنِ وَرید، مقاماتِ بدیع الزمان ہمدانی، رسائلِ صاحب ابنِ عباد، مقاماتِ حریری، مقاماتِ حمیدی، التوسل الی الترسل، اعجازِ خسروی ۵ وغیرہ اس فن کے لوازمات پر تحریر کی گئی چند کتب کے نام ہیں۔ ان کتابوں میں خط کے لیے مناسب عنوان، سرنامے، اختتامیے، موزوں القاب و آداب، فرقِ مراتب، رسومِ تخاطب و کلام، اور حسبِ حال اسلوب اختیار کرنے کے تقاضوں سے بحث کی جاتی۔ مشرقی خط نویسی میں حُسنِ صُورت یا حُسنِ بیان کی اہمیت بنیادی اور مُسلّمہ تھی، جس میں علمی مذاق مقامی رویّوں اور زمانی تغیر کے تابع ترمیم و اضافہ کا عمل جاری رہا۔ یہاں خط نویسی نے سادہ و سلیس اظہارِ مدعا سے رنگین و پُرتصنع عبارت آرائی کی طرف سفر کیا اور جب معاشرے کے مزاج، مجلسی آداب اور ادبی ذوق میں اس طرزِ تحریر کی پذیرائی کی استعداد یا ضرورت نہ رہی تو ایک بار پھر اسلوب کی سادگی کو قبولِ عام حاصل ہوا۔

اپنی عرفی حیثیت میں خط دو افراد کے نجی معاملے سے متعلق دستاویز ہے لیکن غور کیا جائے تو اس کا دائرہ کار کہیں وسیع ہے۔ خط کا اندازِ تخاطب جہاں دو افراد کے ذاتی تعلق اور مراتبِ باہمی کا تعین کرتا ہے وہیں اپنے عہد کے سماجی اور تہذیبی رویوں کو بھی قاری کے سامنے لے آتا ہے۔ خط کا لب و لہجہ اگر ایک طرف مکتوب نگار کی داخلی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے تو دوسری طرف اہلِ نظر کے نزدیک اپنے عہد اور معاشرے پر خارجی تبصرہ بھی۔ مکتوب نگار کی چند سطریں جہاں زبان و بیان اور روزمرہ و محاورہ کی لسانی خصوصیات سامنے لاتی ہیں وہیں ایک محقق کے سامنے گردشِ ماہ و سال، حقیقتِ قلم و قرطاس اور رموزِ املا و رسم الخط سے بھی پردہ اٹھاتی ہیں۔ خطوط کسی عہد یا زبان کے تغیر و تبدل اور ارتقا کے شاہد ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ''مکاتیب علم و ادب کے وہ چھوٹے چھوٹے جواہر پارے ہوتے ہیں جنھیں پڑھتے وقت دماغ پر بوجھ نہیں پڑتا۔ استفادہ بہتر ہوتا ہے اور زحمت کم تر۔''[۲] مکتوبات اور مکتوب نگاری کی اہمیت کا اندازہ ہم ان امور سے کر سکتے ہیں:

۱۔ اِسلامی تہذیب اور خط کا تعلق بڑا پختہ اور قدیمی ہے۔ اِسلامی مکتوب نگاری کی روایت کا آغاز خود پیغمبرِ اِسلام ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ مسلمان ہر روز متعدد بار ان دیکھے خدا سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس پس منظر کی وجہ سے خط کا اِدارہ مسلمانوں کے مزاج کا حصہ بن گیا۔ بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''اُنھوں [مسلمانوں] نے خط کے اِدارے سے جو دِل چسپی لی ہے وہ اُن کے بعض بنیادی ذہنی رجحانات اور اساسی روحانی اقدار کی طرف رہ نمائی کرتی ہے۔ مُسلمانوں کو غیب اور غیب الغیب سے جو گہری دِل چسپی رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ کیوں کہ یومنون بالغیب کا ارشادِ قرآنی اُن کے لیے

نادیدہ روابط کی استواری و محکمی کا ایک بڑا سرچشمہ تھا۔.....اور خط و کتابت بھی ایک ایسا ہی عمل ہے۔

چنانچہ مُسلمانوں کے گزشتہ ادبیات میں خطوط و مکاتیب کے وسیع ذخیرے موجود ہیں۔''ے

۲۔مکتوب نگاری کی اہمیت کے پیشِ نظر عربی، فارسی وغیرہ میں فنِ ترسل پر بہت سی کُتب تصنیف کی گئیں۔جن میں سے فہدالحلبی کی حسن التوسل الیٰ صناعۃ الترسل ،القلقشندی کی صبح الاعشیٰ ،الشریف مرعی بن یوسف کی بدیع الانشاء والصفات فی المکاتبات والمراسلات ،حسن العطار کی انشاء العطار عربی زبان میں جب کہ ابن المویدبغدادی، ہندوشاہ المنشی ،ابوالفضل اور دِیگر بہت سے مصنفین کی تصانیف فارسی زبان میں ملتی ہیں۔

۳۔خاص طور پر اسلامی معاشرے میں مُکاتبت و مراسلت کے فن پر دسترس رکھنے والے اِنشاپردازوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا رہا۔حتیٰ کہ بیش تر اسلامی حکومتوں میں فنِ ترسّل پر عبور رکھنے والے صاحبِ طرز مکتوب نگار طاقت ور وزیر رہے۔عبد الحمید بن یحییٰ، ابنِ عمید، محمود گاواں، فیضی اور ابوالفضل وغیرہ اس سلسلہ کی صرف چند کڑیاں ہیں۔

۴۔خط اگرچہ باقاعدہ ادب نہیں لیکن غیر معمولی خُطوط کو ادبِ عالیہ کا حصہ سمجھا جاتا رہا ہے۔عربی میں عبدالحمید بن یحییٰ، فارسی میں ابوالفضل علامی اور اُردو میں مرزا اسداللہ غالب کے مکاتیب اس کی مثالیں ہیں۔

۵۔مکاتیب کو تاریخی، تہذیبی اور سماجی معلومات کے بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔سائی سیرو کے مکاتیب میں قدیم روم کی تہذیب و معاشرت ملتی ہے۸ تو ابوالفضل کے مکاتیب میں اکبری جاہ و جلال محسوس کیا جا سکتا ہے، حضرت مجددؒ کے مکتوبات میں تحریکِ تجدیدِ اِسلام کی کٹھن جدوجہد کے آثار نظر آتے ہیں تو مرزا غالب کے خُطوط جنگِ آزادی اور مُسلمانوں کی تباہ حالی کے مرقعے پیش کرتے ہیں۔

۶۔خطوط کے سرنامے اور القاب و آداب اپنے وقت کی مجلسی زندگی، فرقِ مراتب اور آدابِ معاشرت کی وضاحت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ مکاتیب میں شخصیات، موضوعات اور کتب و رسائل پر قیمتی آرا اور تبصرے بھی ملتے ہیں۔

۷۔مکتوب نگاری کا سب سے اہم پہلو مکتوب نگار اور کسی حد تک مکتوب الیہ کی زندگی کے اُن گوشوں کو سامنے لانا ہے جو عام حالات میں نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔نجی خطوط میں مکتوب نگار خط کو ذاتی اور غیر ادبی تحریر سمجھ کر بے تکلفی سے اپنے حالات و خیالات مکتوب الیہ تک پہنچاتا ہے۔کسی با اعتماد رفیق کو رازدار بنانے کا عمل مکتوب نگار کی زندگی کے ایسے گوشے سامنے لاتا ہے جو کسی اور طرح سے ممکن نہیں ہوتا۔اگرچہ جدید دور میں مشاہیر کے مکاتیب کی طباعت کا سلسلہ اس تواتر سے چل پڑا ہے کہ اب شاید وہ نجی مکاتیب بھی دِل لگا کر اور قلم سنبھال کر لکھتے ہوں۔خود مرزا غالب کے بہترین خطوط بھی اُن کے وہ خط سمجھے جاتے ہیں جو اُنھوں نے طباعت کو ذہن میں رکھے بغیر لکھے تھے۔اس سب کچھ کے باوجود مولانا غلام رسول مہر کے نجی خطوط میں وضعیت کا امکان کم سمجھتے ہیں کیوں کہ:

ا۔مشاہیرِ ادب کے اذہان میں مکاتیب کی اشاعت کا امکان اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ ادب میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہ کر لیں۔اور ظاہر ہے ایسا امتیازی مرتبہ عمر کے آخری حصے میں ہی ملتا ہے۔لہٰذا مکاتیب کا بیش تر حصہ تکلف اور بناوٹ سے پاک سمجھنا چاہیے۔

۱۱۔ مشاہیر کی شہرت کی وجہ سے بہت سے اجنبی یا رسمی تعلق دار بھی سامنے آجاتے ہیں۔ ایسے مکتوب الیہم سے یقیناً تکلف برتا جاتا ہوگا مگر خاص دوستوں اور دلی تعلق داروں سے ذاتی کوائف کا بلا جھجک اظہار پھر بھی رہتا ہوگا۔

۱۱۱۔ مکتوب نگار بعض اوقات کسی خاص جذباتی کیفیت میں آکر مصلحت کے تقاضے فراموش کر دیتا ہے یا پھر کسی مکتوب الیہ سے کوئی راز بیان کیے بنا چارہ نہیں ہوتا۔ بعض بلند مرتبہ ادیبوں کی سیرت کے کچھ مخفی پہلو اسی کمزوری کی وجہ سے سامنے آئے ہیں۔[9]

۸۔ موجودہ دور میں مشاہیر کے مکاتیب کی اہمیت وافادیت تسلیم شدہ ہے۔ بعض معیاری ادبی رسائل خطوط نمبر اور مکاتیب نمبر کی صورت میں خصوصی اشاعتیں پیش کر چکے ہیں۔ جب کہ جامعات مکاتیب کی تدوین اور حواشی وتعلیقات پر تحقیقی کام کرا رہی ہیں۔ بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> خلاصۂ کلام یہ کہ خط بڑا ہی نازک فن ہے۔ یہ کاری گری بھی ہے اور آئینہ سازی بھی۔ یہ مختصر اور محدود بھی اور وسیع و بے کراں بھی ہے۔ یہ حد سے زیادہ شخصی بھی ہے مگر اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی۔ اس میں دانش بھی ہے اور بینش بھی۔ یہ بہ ظاہر کچھ بھی نہیں مگر اس کا ہر ورق پھر بھی دفتر ہے معرفتِ کردگار اور معرفتِ انسان دونوں کا۔ یہ لکھنے والے کے لیے تو محض عرضِ سخن ہے مگر پڑھنے والے کے لیے گنجینۂ فن بھی ہوسکتا ہے۔ غرض خط ایک جہانِ راز ہے جس کے راز اگر سربستہ رہیں تو سینوں کو گہر ہائے معنی کے دفینے بنا دیں اور آشکار ہو جائیں تو جذبے کی ساری دنیا مشک زار بن جائے۔[10]

خط نویسی کا فن طویل عرصہ سے خبر کی ترسیل کے علاوہ ایک فعال تہذیبی اور ادبی عنصر کے طور پر اپنی مستحکم شناخت رکھتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر خط میں قوتِ اظہار، تہذیبی رچاؤ اور ادبیت کی شان بیک وقت موجود ہوں بلکہ بسا اوقات نظم ونثر میں بلند پایہ مقام کے مالک ادیبوں کے مکاتیب بھی ان صفات سے محروم ہوتے ہیں۔ ہر زبان میں فنِ تحریر کی ایجاد کے فوراً بعد سے خط لکھے جا رہے ہیں مگر ان میں سے ادبی حیثیت کے حامل بہت ہی کم ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے خیال میں ادبی اہمیت کی خط نویسی کے عمل میں کچھ مشکلات ہیں:

> خط نگاری تو بذاتِ خود ایک بڑا فن ہے۔ اور اس میں کامیاب وہی شخص ہوسکتا ہے جو قدرت کی طرف سے اس فن کا فیضان لے کر آیا ہے۔ خط نگار کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اچھی خط نگاری ایک خاص شخصی ماحول پر بھی موقوف ہے۔ خط نگاری کے فن کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب سے آسان فن ہے جو ہر اس شخص کے لیے سہل الحصول ہے جو اس کا قصد کرے۔ مگر تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہی آسان ترین فن نازک ترین فن بھی ہے۔ کیوں کہ اس میں فنی نزاکتوں کی کچھ اس طرح کی مشکل شے ہے جیسے کوئی شے عدم سے وجود حاصل کرتی ہے۔[11]

کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے اور فنی نزاکتوں کے حسنِ توازن کے ساتھ نمود میں آنے کے عمل میں خط نگار کو بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں۔ یہی مشکلات عام خطوط کے خطوطی یا فنی اعتبار حاصل کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ خط کا اولین مقصد ابلاغ ہے۔ اگر خط نویس ابلاغ میں ناکام رہتا ہے تو اس کی تحریر کی ادبی حیثیت تو ایک طرف رہی اسے کسی بھی قسم کا خط قرار دینا جائز نہیں۔

۲۔ خط کا ایک اور بنیادی تقاضا اختصار ہے۔ اختصار ہی میں خط کا حسن ہے۔ طوالت خط کو خطبے میں بدل کر کثرتِ موضوعات اور جزئیات کے در وا کر دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں الجھاؤ اور ذہنی بے ربطی پیدا ہوتی ہے جو خط کی تاثراتی وحدت کے خلاف ہے۔ اختصار جہاں قاری کی دِل چسپی اور خط کی دِل کشی کا ضامن ہے وہیں لکھنے والے سے توجہ کا طلب گار اور دریا کو کوزے میں سمیٹ لینے کے ہنر کا متقاضی بھی ہے۔ گویا بنا شوق کے یا خط نویسی کو مشغلۂ فن کا درجہ دیے بغیر اچھا خط لکھنا ممکن نہیں۔ مناسب توجہ کے بغیر ''خط لکھے ہوئے نہیں ہوتے گھسیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔''[۱۲]

۳۔ خط نویسی میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اپنی اصل کے لحاظ سے خط کسی صنفِ ادب کا نام نہیں۔ اسے ذاتی یا نجی معاملہ سمجھا جانے کا تاثر آج بھی قوی ہے۔ مگر یہ بھی ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ معیاری خط ادبی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ مثلاً، صرف مکتوب نگاری کے بل بوتے پر مرزا غالب اُردو کے رجحان ساز نثر نگار مانے جاتے ہیں۔ خط کی اس متنازع حیثیت کی وجہ سے بھی نویسندہ ادھیڑ بن کی کیفیت میں رہتا ہے؛ وہ اس امید موہوم پر کہ مکتوب الیہ شاید اس کے مکاتیب کبھی طباعت کے لیے منظرِ عام پر لائے گا، خط نویسی کو مشغلۂ فن نہیں بنا سکتا۔ لہٰذا فنی لطافت کا حامل خط وُجود میں نہیں آتا۔ اور جب کبھی کسی ادیب کی دِیگر اصناف میں کمائی گئی شہرت کی وجہ سے ایسے خطوط طبع ہو کر قارئینِ ادب کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو قاری کے حصے میں مایوسی جب کہ مکتوب نگار کے حصے میں ناکامی یا بدنامی آتی ہے۔

۴۔ اگر مکتوب نگار مکاتیب کی اشاعت کا تصور ذہن میں رکھ کر لکھے تو عموماً اس کے مکاتیب لطافتِ اسلوب سے، جو عمدہ خطوط کی پہچان ہے، محروم ہو کر مصنوعیت اور ثقالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خط کا موضوع یا مضمون تو کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر اسے مقبولیت اور امتیاز بخشنے والی صفت اس کی لطافت ہی ہوتی ہے۔ جہاں آورد اور تصنع کی زیادتی ہوئی وہیں خط کی عبارت بوجھل پن اور بے کیفی کا منظر پیش کرنے لگی۔ خط کی مقبولیت بڑی حد تک لطافت کے تابع ہے۔ لطافت ایک عام قاری کو دو افراد کے تحریری مکالمے میں دِل چسپی لینے پر مجبور کرتی ہے۔ دراصل خط گفتگو کا نعم البدل ہے[۱۳] اور ہم جانتے ہیں کہ خوب صُورت اور پُر لطف گفتگو کا ملکہ کم ہی افراد کو حاصل ہوتا ہے۔ گفتگو میں لطافت؛ روانی اور بے تکلفی سے ذاتی مشاہدات و تجربات بیان کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ تحریر میں ان لوازماتِ گفتگو کا اہتمام اِنشائے لطیف کہلاتا ہے:

> جہاں تک اِنشائے لطیف کا تعلق ہے یہ کسی مصنّف کے ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہوتی ہے جو وہ کسی منظر، سرگذشت یا واقعہ سے متاثر ہو کر پیش کرتا ہے اور صنائع بدائع کو بہ روئے کار لا کر نثر کو رنگین اور جاذب بناتا ہے۔[۱۴]

۵۔ خط کی عبارت میں ثقالت کا باعث بننے والی ایک اور خامی جذباتیت کی فراوانی ہے۔ جذباتیت کا بے جا اظہار قاری کو رنجیدہ یا پُر جوش کر دیتا ہے جو خط کے منصب کے خلاف ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے خط کا منصب قاری کو بے چین کرنا نہیں بلکہ اسے ذاتی افکار و افعال میں شریکِ راز بنا کر اعتماد اور طمانیت کا احساس دلانا ہے۔

۶۔ طوالت، ثقالت اور جذباتیت کے بعد خط کا غیر شخصی انداز بھی فنی اعتبار سے اس کا نقص ہے۔ خط میں دل چسپی

کی ایک بڑی وجہ اس کا شخصی لمس ہوتا ہے۔ قاری خط کے ذریعے خط نویس کے منہ سے اس کے دل کی باتیں سننا چاہتا ہے۔ جب مکتوب نگار صیغہ واحد متکلم میں بات کرتا ہے تو قاری اپنے آپ کو مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی محفل میں بیٹھا محسوس کرتا ہے اور یہ احساس اسے مسرت آمیز اعزاز و تفاخر بخشتا ہے۔ غیر شخصی طرزِ تحریر اپنانے کے نتیجے میں خط ایک خشک مضمون کی صورت اختیار کر لیتا ہے جسے پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ارتکازِ توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ خط نویس قاری کو دشتِ مضمون میں بھٹکنے کے لیے اکیلا چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور قاری جلد ہی مشکلاتِ راہ سے گھبرا کر باحسرت و یاس الٹے پاؤں واپس ہو جاتا ہے۔

۷۔ اگر خط میں محض ذاتی نوعیت کی اطلاعات کا تبادلہ ہو تو اس میں کسی سوانح نگار یا مؤرخ کی دل چسپی کا سامان تو ہو سکتا ہے لیکن عمومی دِل چسپی اور ادبی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت اتنی نہیں رہتی۔ ادبی سطح پر خط کی کام یابی اس وقت ممکن ہوتی ہے جب مکتوب نگار عام انسانی محسوسات اور نفسیات کو ذاتی تجربے کی روشنی میں ظاہر کرتا ہے۔ ایسے میں پڑھنے والا ان واقعات کو شخصی احوال کے بجائے انسانی زندگی کے مُرقعے خیال کرتا ہے اور انسانی برادری کا حصہ ہونے کے ناتے خود کو اس واردات میں شامل سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اسی چیز کو خط کی سوشل اپیل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جن خطوں کی انسانی یا سوشل اپیل کام یاب ہوگی وہی خط زیادہ مقبول اور مستقل طور پر دِل چسپ ہوں گے۔''[۱۵]

۸۔ وضاحتی یا توجیہی انداز بھی عمدہ خط کی روح کے خلاف ہے۔ خط میں دِل چسپی کی ایک بڑی وجہ اس کا ذاتی پن ہے۔ خط سے ایک توقع یہ رکھی جاتی ہے کہ خط نگار اس میں اپنے اور اپنے متعلقین کے ذاتی احوال و افکار کے اُن گوشوں سے پردہ اٹھائے جن تک اور کسی ذریعہ سے رسائی ممکن نہیں۔ دِیگر اصناف کی طرح خط میں بھی چہرے پر وضعیت کا نقاب تنا رہے تو خط کی، شخصیت کے حقیقی خط و خال سے تعارف کرانے کی، شہرت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی لیے قبولیت کے درجے تک پہنچنے والے خُطوط میں ہم راز بنانے کی جرأت پائی جاتی ہے۔

۹۔ خط میں عمومی دِل چسپی کی ایک وجہ اس کے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی شخصی خوبیاں اور شہرت ہوتی ہے۔ طرفین کی شہرت ہی قارئین کو خط جیسی نجی دستاویز میں دل چسپی لینے پر اکساتی ہے۔ اس لیے فنی اور ادبی لحاظ سے کام یاب خط عموماً مشاہیرِ علم و ادب یا اربابِ سیاست و دانش ہی کے ہوتے ہیں۔

۱۰۔ اسلوبِ تحریر کی رعنائی اور چاشنی کا خط کی کام یابی میں کلیدی کردار ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مدت گزرنے کے بعد مکتوب میں شامل اطلاعات کی کوئی وقعت پڑھنے والوں کے لیے نہ ہو مگر اس کا اسلوب اگر اپنے دامن میں آفاقی عناصر سمیٹے ہوئے ہے تو ہر دور میں برابر دل چسپی سے پڑھا جاتا رہے گا۔ اُسلوب کی خوبی خط کی تحریر کو مقصود بالذات بنا کر اسے دوام بخشتی ہے۔

صدیوں پر محیط ارتقائی سفر میں مکاتیب کے مختلف نام اور مترادفات مستعمل رہے ہیں۔ صرف اِسلامی روایت میں خط یا مکتوب کے لیے نامہ، مراسلہ، رقعہ اور چٹھی جیسی اصطلاحات مروج ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات کچھ زیادہ باہمی امتیاز نہیں رکھتیں۔

۱۔ خط کے لفظی معانی لکیر، نشانی، ڈاڑھی نکلنا، تحریر یا تحریر پر لکیر پھیر کر کاٹنا ہیں۔ بطورِ اصطلاح خط سے دو معانی مراد لیے جاتے ہیں۔ یعنی ایک تو یہ کہ: ''حروف کے باہم ملاپ اور انھیں قواعد کے مطابق لکھنے کو خط کہتے ہیں اور ایسا کرنے کے لیے

کاغذ، سیاہی اور قلم کا استعمال ضروری ہے۔'' ۱۶؎ اور دوسرے یہ کہ خط، مکاتیب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ مکاتیب اپنی ابتدائی شکل میں شاہی فرامین یا سرکاری مراسلت کی قسم تھے۔ ادبِ اسلامی میں اس کی اولین مثال پیغمبرِ اسلام ﷺ کے مکاتیب ہیں۔ ان مکاتیب میں رسولِ کائنات ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور رئیسوں کو مخاطب کیا۔ برعظیم پاک و ہند میں ابوالفضل کے 'مکاتیب علامی' اسی سلسلہ کی کڑی ہیں:

> مکاتیب انھیں [مکاتیب علامی کو] اس لحاظ سے کہا جائے گا کہ ان میں زیادہ تر شاہی فرامین اور سرکاری اور آئینی معلومات درج ہیں۔ ۱۷؎

فی زمانہ خط یا مکتوب کی اصطلاح بالعموم ذاتی اور نجی خطوط کے لیے برتی جاتی ہے۔ ذاتی خطوط سے مراد ہم ایسی تحریریں لے سکتے ہیں جو کسی خاص دوست، عزیز یا رشتہ دار کو اپنے نجی معاملات یا احساسات و کیفیات سے متعلق لکھی جاتی ہیں۔ صاحبِ کشافِ تنقیدی اصطلاحات اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> .....مکتوب میں شخصیت کے اظہار اور ذاتی جذبات و احساسات کے شمول کی گنجائش ہر دوسری تحریر کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ ۱۸؎

۲۔ نامہ بھی خط یا مکتوب کے معنوں میں مستعمل رہا ہے۔ اس سے بھی ذاتی نوعیت کے، خاص کر کے عاشقانہ خطوط مراد لیے جاتے تھے۔ نامہ سے قاصد کے لیے نامہ بر کی اصطلاح بھی وجود میں آئی:

بس ہو چکا بیاں کسل و رنجِ راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

۳۔ مراسلہ کے لفظی معنی ارسال کردہ ہیں۔ مراسلات اُن مکاتیب کو کہا جاتا رہا جو ہم رتبہ افراد ایک دوسرے کو لکھتے۔ فارسی لغات میں مراسلے کا یہ مفہوم یعنی ''ایسا خط جو اپنے مقابلہ کے اور ہم مرتبہ آدمی کو لکھا جائے'' ۱۹؎ ملتا ہے۔ ایسے ہم مرتبہ افراد صوبوں اور ریاستوں کے والی یا دیگر اربابِ بست و کشاد تھے:

> سرکاری مراسلات صُوبے داروں یا دوسرے حکامِ بالا کے نام لکھے جاتے تھے۔ ان میں نظم و نسق، مال گزاری اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ہدایات درج ہوتی تھیں۔ ۲۰؎

عربوں میں سرکاری سطح پر مراسلہ نگاری کے لیے 'شعبۂ رسائل' قائم کیا گیا ۲۱؎۔ مغلوں کے ہاں مراسلات کی تحریر و ترسیل کے لیے 'دیوانِ رسالت' کا اِدارہ تشکیل دیا گیا جس کا سربراہ دبیر کہلاتا تھا جب کہ منشی اور کاتب دِیگر اہم اہل کار ہوتے تھے۔ موجودہ زمانے میں بھی مراسلہ سے مراد سرکاری خط ہی لیا جاتا ہے البتہ اب اس کے مکتوب الیہ خواص کے علاوہ عوام بھی ہوتے ہیں۔

۴۔ رقعہ بھی خطوط کے لیے استعمال ہونے والی اصطلاح ہے۔ رقعہ کے لغوی معنی کاغذ کا پرزہ ہیں۔ بطورِ اصطلاح رقعہ سے مراد مختصر سی ذاتی نوعیت کی تحریر ہے۔ رقعاتِ عالم گیری اس کی بہترین مثال ہے۔ زمانۂ قدیم میں شادی کے تحریری پیغام کے لیے بھی یہ اصطلاح مستعمل رہی ۲۲؎۔ نام ور خطاط ابن مقلہ نے ۳۱۰ ہجری میں جو چھے خط رسمِ تحریر کے لیے

ایجاد کیے اُن میں سے ایک کا نام رقاع ہے ۲۳۔ رقاع رقعہ کی جمع ہے۔ چوں کہ عوام زیادہ تر اسی رسم الخط میں رقعے لکھتے تھے اس لیے رقاع نام پڑ گیا، بالکل اسی طرح جیسے شاہی فرامین کے حامل رسم الخط کا نام توقیع پڑ گیا۔ رقعات اپنی اصل میں عربی 'اخوانیات' سے قریب تر معلوم ہوتے ہیں۔ اخوانیات کے مخاطب بھی عزیز و اقارب ہی ہوتے ہیں۔ میرزا مقبول بیگ بدخشانی رقعات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''رقعات عموماً ذاتی نوعیت کے خطوط ہوتے ہیں۔ نویسندہ رقعات میں ذاتی اور گردوپیش کے حالات بیان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ذاتی باتیں کسی تکلف اور تصنع کے بغیر ہی لکھی جاتی ہیں۔ اب اگر لکھنے والا ادیب ہے تو بلا ارادہ اس کی تحریر میں ادب کی چاشنی بھی آ جاتی ہے۔ اس قسم کے رقعات منشآت سے قریب تر ہوتے ہیں لیکن ذاتی حالات کی عکاسی کرنے کی وجہ سے وہ رقعات ہی ہوں گے۔'' ۲۴

۵۔ چٹھی کی اصطلاح بھی خط کے مترادف کے طور پر اُردو زبان میں مروج ہے۔ یہ اصطلاح بھی اپنے سارے مترادفات کے معانی دیتی رہی۔ اب چٹھی سے مراد سرکاری خط لیا جاتا ہے۔

خطوط کو بہ لحاظِ موضوع بھی متعدد اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بہ قول:

''خط و کتابت کی بیسیوں اقسام ہیں۔ مثلاً سیاسی، دفتری، تجارتی، کاروباری، عام معمولی اطلاعاتی، علمی اور معلوماتی، شخصی، جذباتی، خیالی وغیرہ وغیرہ۔'' ۲۵

مرزا محمد منور اپنے مضمون بہ عنوان 'انشا و مکتوبات' میں مکاتیب کی اقسام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''.....مکتوب نگاری بھی دو طرح کی ہے۔ ایک رسمی اور ایک خاص یعنی نجی۔ رسمی مکتوب نگاری سرکاری بھی ہے اور کاروباری بھی۔ خاص مکتوب نگاری میں عزیزوں اور دوستوں سے خطاب ہوتا ہے۔ اس نوعِ خاص کو عربی میں 'اخوانیات' کہتے ہیں۔'' ۲۶

درج بالا تعریفوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ بنیادی طور پر خطوط کی دو ہی قسمیں یعنی رسمی اور نجی خطوط ہیں۔ حکومتی، سیاسی، تجارتی، دفتری، یا معلوماتی خطوط دراصل رسمی خطوط ہی کی اقسام ہیں۔ جب کہ شخصی، جذباتی، خیالی وغیرہ نجی خطوط کی شاخیں ہیں۔ لہٰذا خطوط کی مختلف اقسام کا ان ہی دو عنوانات کے تحت جائزہ لیا جا سکتا ہے:

ا۔ خط نویسی کا آغاز و ارتقا رسمی خطوط ہی کے ذریعے ہوا۔ چوں کہ زمانۂ قدیم میں منزلِ مقصود تک خط کی ترسیل ایک مشکل کام تھا، اس مقصد کے لیے پُر خطر راستوں سے گزر کر دور دراز کی منزلوں تک بہ حفاظت آمد و رفت کا تجربہ رکھنے والے ہوشیار قاصد درکار تھے، جو صرف حکمرانوں کو دستیاب تھے۔ چنانچہ شروع میں اسی طبقہ کے زیرِ نگرانی تحریر یا ترسیل کیے گئے سیاسی یا سرکاری خطوط ملتے ہیں۔ ادبِ اسلامی میں بھی حضراتِ انبیاؑ یعنی حضرت سلیمانؑ [جن کے مکتوب بہ نام ملکہ سبا کا ذکر قرآن مجید میں ہے] اور نبیِ آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی استثنائی مثالوں کے بعد مکتوب نگاری کے اولین مظاہر خلفا اور امرا ہی کے زیرِ نگرانی ملتے ہیں۔ انبیاؑ کے مکاتیب تو منصبِ نبوت کے مطابق ترویجِ توحید کے لیے تھے البتہ خلفا اور امرا کے خطوط ابتدائی سیاسی یا

سرکاری خطوط کہلائیں گے۔ ابتدائی سیاسی مراسلات میں سادگی اور متانت سے اظہار مدعا کیا جاتا۔ خلفائے راشدین بالعموم خود نوشتہ مکتوب تحریر فرماتے۔ مگر اموی خلفا کے دور میں سرکاری مراسلات میں ندرتِ خیال اور جزالت بیان کے لیے 'شعبۂ رسائل' قائم کیا گیا۔ جہاں فنِ مکاتبت و مرسلت میں دسترس رکھنے والے دبیر اور منشی فنِ انشا میں مہارت کے جوہر دکھلاتے۔ برِصغیر کی اسلامی حکومتوں میں بھی اسی روش کی تقلید میں 'دیوانِ رسالت' قائم ہوئے۔ عہدِ حاضر کی دفتری مراسلت کو اس کی ارتقائی شکل کہا جا سکتا ہے۔ البتہ موجودہ دفتری مراسلت میں بجائے کسی جدت طرازی کے لگے بندھے اسلوب کی پیروی کی جاتی ہے نیز اس طرزِ مراسلت میں حتی الامکان اختصار برتا جاتا ہے۔

۲۔ علمی خط، مکتوب نگاری کی دوسری قسم ہے۔ علمی خطوط سے مراد ایسے خطوط ہیں جن میں علمی مسائل پر بحث و تمحیص ہو اور جن کا مخاطب فردِ واحد نہ ہو۔ اسلامی روایت میں صوفیۂ کرام کے مکاتیب علمی خطوط کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان مکاتیب کا موضوع عموماً تلقین و وعظ یا مسائلِ دین سے بحث ہے یا کسی مسئلے کا جواب ہے۔ خط کسی ایک مرید کو لکھا جاتا مگر بستی میں موجود جملہ مریدین حلقہ بہ گوش ہو کر سنتے۔ بیش تر چشتی صوفیہ کے خطوط کے علاوہ شیخ احمد سرہندیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ کے خطوط علمی خطوط کی مثالیں ہیں۔ جدید دور میں علامہ اقبال اور سید ابوالاعلا مودودی کے مکاتیب اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔

۳۔ تجارتی یا معاملاتی خطوط تہذیبِ نو کی دین ہیں۔ درپیش معاملے کی باریکیوں کو مروج قانونی اور تجارتی اصطلاحات کی مدد سے طے کرنا اس طرزِ خط نویسی کا مقصد و منشا ہوتا ہے۔ یہ خطوط خصوص ظاہری ساخت کے حامل ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ، غمی خوشی یا دیگر مذہبی اور سماجی تقریبات کے دعوت نامے، اخبارات کے مدیران اور حکامِ بالا کے نام کسی اجتماعی مسئلے کی طرف توجہ دلانے والے خطوط بھی معاملاتی خطوط ہی کی ذیل میں آتے ہیں۔

۴۔ ذاتی نوعیت کے خطوط جو عزیزوں، دوستوں، رشتہ داروں وغیرہ کے نام تحریر کیے جاتے ہیں نجی خطوط کہلاتے ہیں۔ ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے یہ خطوط ارفع تر ہوتے ہیں۔ بلکہ جب ادبی، فنی یا سوانحی نقطۂ نظر سے خطوط کا تذکرہ ہوتا ہے تو عموماً اس سے مراد ذاتی یا نجی مکاتیب ہی لیے جاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ مطالعۂ مکاتیب کا ایک بڑا مقصد مکتوب نگار کی زندگی کے مخفی گوشوں اور حقیقی افکار سے شناسائی حاصل کرنا ہوتا ہے؛ اور مکتوب نگار ذاتی زندگی کے یہ پہلو صرف خاص اور بااعتماد تعلق داروں ہی کے سامنے لاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> خطوط نگاری انسان کا نجی فعل ہے..... خط کی غائت اولاً خبر رسانی بھی ہے اور مخاطب کو رازداں بنانا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا بھی..... خط میں انسان اپنی ذات کی کمین گاہ کے دروازے صرف اپنے دوست کے لیے کھولتا ہے اور اپنی آرزوؤں تمناؤں اور خواہشوں میں مکتوب الیہ کی شرکت کو ایک دوستانہ فعل شمار کرتا ہے۔ ۲۷

مولانا غلام رسول مہر بھی جن خطوط و مکاتیب سے تکلف برطرف رکھنے کی توقع رکھتے ہیں وہ اپنی اصل میں نجی خطوط ہیں:

> تحریر و نگارش کے ذخیروں میں سے صرف ایک صنف ایسی ہے جس کے متعلق وضعیت و تکلف کے اختلاط و آمیزش کی کم سے کم گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ یعنی بزرگانِ علم و فضل اور اکابرِ حکمت و دانش کے خطوط و مکاتیب جو انھوں نے اپنے عزیزوں دوستوں اور نیاز مندوں کو لکھے۔'' ۲۸

درج بالا اقتباسات سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اربابِ علم و دانش کے نزدیک ادبی افادیت کے حامل خطوط سے مراد عمومی طور پر نجی خطوط ہی ہوتے ہیں۔

۵۔ شخصی خطوط سے مراد ایسے خطوط ہیں جن میں خط نویس اپنے شخصی جذبات و کیفیات کا اظہار ایسے پیرائے میں کرے کہ پڑھنے والا اسے اپنے ذاتی تجربات یا عمومی انسانی حالات پر محمول کرے:

''.....جن خطوں میں شخصی جذبے کا استعمال کچھ ایسے انداز میں ہوا ہے کہ شخصی ہونے کے باوجود اس کی حیثیت وسیع معنوں میں انسانی ہوگئی ہے، ان خطوں کی دل چسپی اور دیرپا مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔''۲۹

شخصی مکاتیب نجی مکاتیب ہی کا حصہ سمجھنے چاہئیں۔

۶۔ جذباتی خطوط میں خط نگار جذباتی اندازِ بیان اپناتا ہے۔ ظاہر ہے جذبات کا بلا جھجک اظہار نجی یا ذاتی خطوط ہی کیا جاسکتا ہے۔ عاشقانہ خطوط بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں، ان میں جذباتیت اور جمال پرستی جیسے رومانی عناصر پائے جاتے ہیں۔ انگریزی ادب میں فینی براؤن کے نام کیٹس کے خطوط جب کہ اُردو میں عطیہ فیضی کے نام شبلی نعمانی کے خطوط جذباتی یا عاشقانہ مکتوب نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

۷۔ خیالی خطوط میں مکتوب نگار کا روئے سخن کسی فرضی مکتوب الیہ کی طرف ہوتا ہے یا کم از کم اس کا ترسیلِ خط کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا بلکہ محض ہم کلامی کا شوق اسے خامہ فرسائی پر مجبور کرتا ہے:

''خط کی بنیادی ضرورت یا بنیادی جذبہ ہم کلامی کی تمنا ہے۔ وہ خط جن کا مخاطب جسماً کوئی بھی نہیں ہوتا وہ بھی صورت اور رسم کے اعتبار سے ہم کلامی کی آرزو ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔''۳۰

۸۔ افسانوی خطوط بھی کوئی حقیقی مکتوب الیہ نہ ہونے کی وجہ سے خیالی خطوط ہی کے ضمن میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ انگریزی ادب میں ایپس ٹلری epistolary ناول بھی افسانوی خطوط کی مثال ہے۔ رچرڈسن کے ناول پامیلا [۱۷۴۰ء] اور کلاسک ہارلو [۱۷۴۸۔۱۷۴۷ء] جب کہ سمال لٹ کا ہمفرے کلن کر [۱۷۷۱ء] اس کی نمائندہ مثالیں ہیں ۳۱۔ اُردو میں لیلیٰ کے ''خطوط'' از قاضی عبدالغفار ''غبارِ خاطر'' از مولانا ابوالکلام آزاد، ''آوارہ گرد کی ڈائریاں'' از میرزا ادیب کا شمار افسانوی یا خیالی خطوط میں کیا جاسکتا ہے۔

عہدِ حاضر میں ظاہری ہیئت یا تحریری کیفیت کے لحاظ سے خطوط کی دو مزید اقسام، قلمی اور ٹائپ شدہ بھی سامنے آئی ہیں۔ خطوط یا مکاتیب کی صدیوں پر محیط روایت میں مشاہیرِ علم و ادب کے خود نوشتہ خطوط ہی مروج و مقبول رہے۔ اس کی وجہ وسائلِ طباعت کی غیر ترقی یافتہ صورت اور کم یابی کے علاوہ خط کا بہ قلمِ خود لکھنے کا تصور بھی تھا۔ آج بھی اخبارات و جرائد صاحبِ طرز مکتوب نگاروں کے صرف قلمی مکاتیب ہی بہ طورِ نمونہ چھاپتے ہیں۔ لیکن آلاتِ تحریر کی ترقی اور ارزانی نے سرکاری اور دفتری مراسلات کے علاوہ نجی خطوط میں بھی ٹائپ کو متعارف کرادیا۔ اس سے ٹائپ شدہ خطوط کو مکاتیب سے وابستہ عزت و تکریم دینے یا نہ دینے کا سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔

مکاتیب کی اہمیت جتلاتے ہوئے، جو محاسن گنوائے جاتے ہیں اُن میں مکتوب نگار کا شخصی لمس اور اس کے

طرزِ تحریر و املا تک براہِ راست رسائی کا ذکر بہ طورِ خاص کیا جاتا ہے۔ لیکن ٹائپ شدہ خط میں ظاہر ہے کہ ایسا ممکن نہیں رہتا۔ نوکِ قلم سے ابھرنے والے نقطوں، شوشوں، دائروں اور لکیروں کے پیچھے سے جھانکتی شخصیت کے بجائے سپاٹ، یک رنگے اور بے چہرہ حروف ملتے ہیں جو مفہوم کی نشان دہی تو کرتے ہیں لیکن مکتوب نگار کے بارے میں گہری چپ سادھ لیتے ہیں۔ مزید یہ کہ اُردو ٹائپ کے آغاز سے اس میں کُچھ کم زوریاں ایسی چلی آرہی ہیں کہ بعض الفاظ کے املا میں کاتب اپنے نظامِ املا کی پیروی کے بجائے مشین کی ضد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ لیتھو [سنگی] اور فوٹو آفسٹ طباعت سے لے کر جدید ترین کمپیوٹر کمپوزنگ تک کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ جون ۲۰۰۹ء میں طبع ہونے والی کتاب مکاتیبِ رشید حسن خاں بہ نام رفیع الدین ہاشمی کے مرتب لکھتے ہیں:

> یہ وضاحت ضروری ہے کہ کمپیوٹر کمپوزنگ (مشینی کتابت) کے عدمِ تعاون کی وجہ سے ''کہہ'' کا املا خاں صاحب کے مطابق اختیار نہیں کیا جاسکا۔ ۳۲

یہ صُورتِ حال، خصوصاً مکاتیب کے حوالے سے کہ جن کا ایک مقصد مکتوب نگار کے سوادِ تحریر تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے، پریشان کن بن جاتی ہے۔

ٹائپ کی صورت میں مکتوب نگار لاشعوری طور پر خط کی نوک پلک درست کرنے اور حرفوں کی تہذیب میں منہمک ہو جاتا ہے اور یوں بے ساختگی، جو کہ عمدہ خطوط کی پہچان ہے اور جو عموماً اس وقت وجود میں آتی ہے جب مکتوب نگار مکتوب کی طباعت کے امکان یا خدشے کو ذہن میں لائے بغیر قلم برداشتہ لکھتا ہے، عنقا ہو جاتی ہے۔ فنی لحاظ سے کام یاب مکاتیب کی پہچان بے تکلفی، سادگی اور روانی سے کسی محرمِ راز پر حالِ دِل افشا کرنا ہے۔ گویا اس عمل میں اصل محرک آمد ہے اور آمد کی رفتار سے کاتب کا قلم نباہ کر سکتا ہے ٹائپ کی کھٹ کھٹ نہیں۔

ٹائپ میں لکھے ہوئے کو مٹایا اور بدلا جاسکتا ہے۔ لکھنے، مٹانے اور بدلنے کا یہ عمل آورد کا پتا دیتا ہے اور آورد کا جھکاؤ حق گوئی سے زیادہ مصلحت کی طرف ہوتا ہے۔ دوسری طرف ہاتھ کے لکھے میں ناپسندیدہ کو کاٹا جاسکتا ہے مٹایا نہیں جاسکتا، اور سب جانتے ہیں کہ کاٹا ہوا لفظ کٹی ہوئی زبان سے بولتا ہے اور لکھنے والے کے اسلوب اور ذہنی کش مکش کی وضاحت چٹکیاں لے لے کر بیان کرتا ہے۔ چنانچہ مشین نے جب جیتے جاگتے انسان کو ٹائپ کے جامد حروف کے پیچھے گم کر دیا تو صدائے احتجاج بلند ہوئی:

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

اکبر الہ آبادی کی شاہ ایڈورڈ کے نام کی دہائی کو محض فکرِ کہن پر اڑ جانے والے ایک قدامت پسند کی سوچ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے لوح و قرطاس کے علاوہ در و دیوار سے لے کر منبر و محراب تک کو اپنی خطاطی کے ذریعے ہیشگی دینے والی قوم کا اجتماعی رویہ سمجھنا چاہیے۔ اس قوم کو جب لیتھو ٹائپ کے بے جان حروف سے واسطہ پڑا تو اس کی آنکھوں میں نامانوس سی چبھن ہوئی اور اس نے بلا اختیار صدائے احتجاج بلند کی۔ دِیگر معاملات میں بھلے یہ سوچ اندیشہ ہائے بے جا ہی کیوں نہ ہو لیکن خُطوط کے حوالے سے اس میں خاصی صداقت یُوں نظر آتی ہے کہ مکتوب نگار مکتوب الیہ کو معاملاتِ تکلف میں محرمِ راز بنانے کا مدعی ہوتا ہے مگر ٹائپ کے حروف ہر دو میں نامحرمی کی چادر تان دیتے ہیں۔

ان مسائل یا خامیوں کے باوجود ٹائپ شدہ خطوط کو ادبی یا فنی نقطۂ نظر سے کلی طور پر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ قلمی خط بھی استفادۂ عام کے لیے بہ ہر حال ٹائپ کر کے ہی پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ٹائپ شدہ خط میں ذیل کی خصوصیات موجود ہوں تو اسے فنی یا ادبی اہمیت حاصل رہے گی:

۱۔ ٹائپ خط کا مکتوب نگار فردِ واحد ہو اور اس نے یہ خط اپنی ذاتی حیثیت میں لکھا ہو۔ کتنا ہی بڑا ادیب اگر کسی سرکاری یا ادارہ جاتی ضرورت کے لیے خط لکھے گا تو ظاہر بات ہے اس کے مندرجات ادبی چاشنی سے محروم اور محکمانہ تقاضوں کے ماتحت ہوں گے۔

۲۔ خط کے متن سے یہ یقین ہو جائے کہ خط نویس کے ذاتی خیالات پر مشتمل ہے نہ کہ بہت زیادہ رسمی اور محض دستخط شدہ۔

۳۔ ٹائپ شدہ خط کا مکتوب الیہ بھی واحد ہو۔ اگر ایک ہی ٹائپ شدہ متن کی نقول پر مشتمل خطوط بہت سے مکتوب الیہم کو علیحدہ علیحدہ بھیجے گئے ہوں تو وہ، ذاتی تعلق یا خط سے وابستہ سنسنی خیزی سے خالی، محض رسمی سے اطلاع نامے یا دعوت نامے بن جائیں گے۔ البتہ ایسا ٹائپ خط، جو لکھا تو واحد مکتوب الیہ کو گیا ہو مگر اس میں دیگر بے تکلف تعلق داروں کو بھی مخاطب کیا گیا ہو، ادبی خطوط میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ خط کے متن میں عمومی یا ادبی دل چسپی کے حوالے سے کوئی تبصرہ یا بات چیت ہو۔

یہاں اس حقیقت کے دُہرانے کی تو ضرورت نہیں کہ خط ٹائپ ہو یا قلمی، کسی قسم کا ہو یا ہیئت کا، اس کی تاریخی یا دستاویزی حیثیت تو بہ ہر حال مسلمہ ہے۔

حواشی:

۱۔ عربی ادب کی تاریخ، عبدالحلیم ندوی، مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۹۸۔

۲۔ سیرۃ النبیؐ، علامہ شبلی نعمانی، المصباح، اُردو بازار لاہور، س۔ن، ص: ۲۰۹۔

۳۔ رسومِ جاہلیت، مولانا نجم الدین سیوہاروی، مکتبۂ رشیدیہ لمیٹڈ، لاہور، مئی ۱۹۸۸ء، ص: ۱۲۲۔

۴۔ اُردو رسم الخط، پروفیسر سید محمد سلیم، مقتدرہ قومی زبان، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص: ۱۵۔

۵۔ انشا و مکتوبات، مرزا محمد منور، مشمولہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، تیسری جلد، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص: ۳۵۹۔

۶۔ علم و ادب میں خطوط کا درجہ، غلام رسول مہر، مشمولہ نقوش [مکاتیب نمبر] ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، نومبر ۱۹۵۶ء، ص: ۱۴۔

۷۔ اُردو خط نگاری، ڈاکٹر سید عبداللہ، مشمولہ نقوش [مکاتیب نمبر] ادارہ فروغ اُردو، لاہور، نومبر، ۱۹۵۶ء، ص: ۵۵۔

۸۔ وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام، انور سدید، مکتبۂ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص: ۸۔

۹۔ علم و ادب میں خطوط کا درجہ مشمولہ نقوش، ص: ۱۳۔

۱۰۔ اُردو خط نگاری مشمولہ نقوش، ص: ۲۴۔

۱۱۔ اُردو خط نگاری مشمولہ نقوش، ص: ۱۸۔

۱۲۔ ایضاً،ص:۲۴۔

۱۳۔ ایضاً،ص:۲۵۔

۱۴۔ انشا،میرزا مقبول بیگ بدخشانی،مشمولہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند[چوتھی جلد]،پنجاب یونی ورسٹی، لاہور،۱۹۷۱ء،ص:۸۰۶۔

۱۵۔ اُردوخط نگاری،مشمولہ نقوش،ص:۱۹۔

۱۶۔ تدریسِ کتابت،محمد رفیق رضا محمودی،کتب خانہ مجیدیہ،ملتان،س.ن ،ص:۲۔

۱۷۔ انشامشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند،ص:۸۰۶۔

۱۸۔ کشافِ تنقیدی اصطلاحات،ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،ستمبر۱۹۸۵ء،ص:۱۸۶۔

۱۹۔ لغاتِ فارسی،دارِعمر فاروق،حضرو،س.ن،ص:۷۹۰۔

۲۰۔ انشامشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند،ص:۸۰۶۔

۲۱۔ انشاومکتوبات مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند،ص:۳۶۰۔

۲۲۔ فرہنگِ تلفظ،شان الحق حقی،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص:۵۷۵۔

۲۳۔ تدریسِ کتابت،محمد رفیق رضا محمودی،ص:۲۔

۲۴۔ انشامشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند،ص۸۰۶۔

۲۵۔ اُردوخط نگاری مشمولہ نقوش،ص:۱۷۔

۲۶۔ انشاومکتوبات مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند،ص:۳۶۰۔

۲۷۔ وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام،انور سدید،ص:۷۔

۲۸۔ علم وادب میں خطوط کا درجہ مشمولہ نقوش،ص:۱۳۔

۲۹۔ اُردوخط نگاری مشمولہ نقوش،ص:۱۹۔

۳۰۔ اُردوخط نگاری مشمولہ نقوش،ص:۲۰۔

۳۱۔ اے ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز؛ جے اے کڈن، پنگوین بکس، یوکے،۱۹۸۵ء،ص:۲۴۹۔

۳۲۔ مکاتیب رشید حسن خان بنام رفیق الدین ہاشمی،ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد،ادبیات اُردو بازار،لاہور،جون ۲۰۰۹،ص۱۵۔

فہرست اسنادِ محولہ:

۱۔ باقر،محمد،(۱۹۷۱ء)مشمولہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند''،تیسری جلد،پنجاب یونیورسٹی،لاہور۔

۲۔ حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز،(۱۹۸۵ء)،''کشاف تنقیدی اصطلاحات''،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد۔

۳۔ حقی،شان الحق،(۲۰۰۸ء)،''فرہنگ تلفظ''،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد۔

۴۔ رضا محمودی،محمد رفیق،(ندارد)،''تدریس کتابت''،کتب خانہ مجیدیہ،ملتان۔

۵۔ سدید،انور،(۱۹۸۶ء)،''وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام''،مکتبۂ فکر وخیال،لاہور۔

۶۔ سیوہاری، مولانا انجم الدین، (۱۹۸۸ء)، ''رسوم جاہلیت''، مکتبۂ رشیدیہ لمیٹڈ، لاہور۔
۷۔ کڈن، جے، اے، (۱۹۸۵ء)، ''اے ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز''، پیکوئن بکس، یو۔کے۔
۸۔ محمد سلیم، پروفیسر، سید، (۱۹۸۱ء)، ''اردو رسم الخط''، مقتدرہ قومی زبان، کراچی۔
۹۔ مقبول بیگ بدخشانی، مرزا، (۱۹۷۱ء)، مشمولہ: '' تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند''، چوتھی جلد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔
۱۰۔ ناشاد، ارشد محمود، (۲۰۰۹ء)، ''مکاتیب رشید حسن خان بنام رفیع الدین ہاشمی، ادبیات، لاہور۔
۱۱۔ ندوی، عبدالحلیم، (۱۹۸۸ء)، ''عربی ادب کی تاریخ''، مکتبۂ تعمیر انسانیت، لاہور۔
۱۲۔ نعمانی، شبلی، (ندارد)، ''سیرۃ النبی''، (جلد اوّل)، المصباح، لاہور۔

رسالہ:

۱۔ طفیل، محمد، (نومبر ۱۹۵۶ء)، ''نقوش (مکاتیب نمبر)''، ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔